مقالات

مسئلۂ سود پر ایک معاشی نظر

(۲)

از جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

[افسوس ہے کہ اشاعت گذشتہ میں اس امر کی تصریح نہیں کی جا سکی کہ مولانا ممدوح کا یہ مضمون اس سے پہلے اخبار "سچ" میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس ایک دوست کے ذریعہ سے اس مضمون کی ایک غیر مطبوعہ نقل آئی تھی اس لیے اشاعت کے وقت یہ غلط فہمی ہوئی کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ اب اس فروگذاشت کی تلافی کی جاتی ہے۔ ایڈیٹر]

غیر اسلامی مقبوضات کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

غیر اسلامی مقبوضات کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس ملک میں اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی، یا ہوئی لیکن بین الاقوامی کشمکش کے سلسلہ میں اس ملک پر غیر اسلامی قوتوں کا قبضہ ہو گیا۔ پہلی صورت میں تو ایسے ملک کے غیر اسلامی مقبوضہ اور غیر مسلم مملکت ہونے میں کیا شبہہ ہے۔ غیر اسلامی حکومت کو اسلامی حکومت کون کہہ سکتا ہے؟ لیکن بحث ذرا دوسری صورت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ قاضی القضاۃ للدولۃ العباسیہ امام ابو یوسف اور مدون فقہ حنفی امام محمد شیبانی کا اس کے متعلق فتویٰ یہ ہے:-

اِنّ دار الاسلام تصیر دار الکفر بظہور احکام الکفر فیھا، (بدائع الصنائع کاسانی ج ۷، ص ۱۳۱)

دار الاسلام (اسلامی ملک) اس وقت دار الکفر (غیر اسلامی ملک) ہو جاتا ہے جب کہ غیر اسلامی (کفر) کے قوانین کا وہاں ظہور (نفاذ) ہو جائے۔

فتاوائے عالمگیریہ میں غیر اسلامی احکام کے ظہور کی شرح یہ کی گئی ہے :-

ای علی الاشتھار و ان لا یحکم فیھا بحکم اھل الاسلام۔	یعنی علانیہ ظہور ہو اور اس ملک میں اہل اسلام کے قوانین سے فیصلے نہ کیے جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس ملک میں اللہ کے کلام اور خاتم النبیین کے ارشادات گرامی سے اخذ کردہ قانون نافذ نہ رہے وہی ملک غیر اسلامی ملک اور وہی حکومت غیر اسلامی حکومت سمجھی جائے گی، خواہ وہاں کوئی قانون نافذ نہ ہوا ہو تو غیر اسلامی دماغوں یا غیر اسلامی مستندات سے ماخوذ ہو۔ بہرحال جس ملک سے اسلامی حکومت کا قانون زائل ہو گیا اور اس میں غیر اسلامی قانون نافذ ہو گیا نہ وہ اسلامی ملک باقی رہتا ہے اور نہ وہ حکومت اسلامی حکومت سمجھی جا سکتی ہے۔ اور یہ تو پھر بھی ایک اجمالی تعبیر ہے، امام الائمہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ وضاحت سے کام لے کر غیر اسلامی ملک کی حقیقی تنقیح ان لفظوں میں فرمائی ہے :-

ان دار الاسلام لا تصیر دار الکفر الا بثلاث شرائط احدھا ظھور احکام الکفر فیھا الثانی ان تکون ملحقۃ لدار الکفر و الثالث ان لا یبقی فیھا مسلم او ذمی امنا بالامان الاول بدائع الصنائع کاسانی ج ۷، ص ۱۳۰	دار الاسلام (اسلامی ملک)، دار الکفر (غیر اسلامی ملک) تین شرطوں سے ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کفر کے احکام (غیر اسلامی قوانین) کا وہاں ظہور (نفاذ) ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی دار الکفر (غیر اسلامی ملک) سے متصل نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس ملک میں کوئی مسلمان یا ذمی اس امان کے ساتھ نہ ہو جو اسے پہلے حاصل تھی۔

یوں تو دنیا میں اس وقت زیادہ تر غیر اسلامی حکومتیں ہیں لیکن نہ ان کے واقعی حالات میرے سامنے ہیں اور نہ ان کی تمام خصوصیات کے متعلق میرے پاس کوئی شرعی شہادت موجود ہے، لیکن

ستان ہمارے سامنے موجود ہے۔ بطور مثال اسی ملک کو لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ امام
رحمۃ اللہ علیہ نے غیر اسلامی ملک کی جو قانونی تنقیح فرمائی ہے وہ اس پر کس حد تک منطبق ہے۔
یہ تو ظاہر ہے کہ اس ملک میں شریعت کی نہیں بلکہ انگریزی قانون کی حکومت ہے۔ کلام اللہ
احادیث نبویہ سے جو اسلامی قانون پیدا ہوتا ہے وہ یہاں قطعاً نافذ نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی دماغوں
وہ ایک ہوں یا چند ہندی ہوں یا غیر ہندی، کے تجویز کردہ قوانین اس ملک میں نافذ ہیں۔
لحاظ سے تو اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ غیر اسلامی احکام کا ظہور "نفاذ" جو امام رحمۃ اللہ
کی تنقیح کی پہلی شرط تھی وہ اس پر بالکلیہ منطبق ہے۔

اسی طرح دوسری شرط کے انطباق پر بھی کون شبہ کر سکتا ہے؟ جغرافیائی طور پر کس کو معلوم
ہے کہ ہندوستان کے اکثر حدود غیر اسلامی ممالک اور حکومتوں سے متصل ہیں اور اس طرح متصل ہیں
بیچ میں کوئی اسلامی ملک واقع نہیں ہوتا۔ عالمگیری میں ہے:

الاتصال بان لا یتخلل بینھما بلدۃ عدم اتصال کا مطلب یہ ہے کہ دارالکفر اور دارالاسلام
بلاد الاسلام (منقول از شامی ص ۲۷۶) کے درمیان کوئی اسلامی شہر واقع نہو۔

شمال اور مشرق تو خشکی کے حدود سے محدود ہیں۔ رہے دریائی حدود تو اولاً بالبداہتہ ان دریاؤں
اسلامی قوتوں کا کامل اقتدار موجود ہے حتیٰ کہ بغیر ان کی اجازت کے ان سمندروں میں کوئی
اپنا کوئی جہاز بھی چلا نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر ایسا نہ بھی ہو تو صرف خشکی کا اتصال ہی تکمیل
کے لیے کافی ہے۔ نیز فقہائے اسلام کی عام تصریح سمندروں کے متعلق یہ ہے۔

بحر الملح ملحق بدار الحرب (شامی ص ۲۷۶) دریائے شور کا شمار غیر اسلامی مقبوضات میں ہے۔

بہر حال جس طرح بھی سوچو، اس شرط کی تحقیق میں بھی کوئی دغدغہ باقی نہیں ہے۔ امام رحمۃ اللہ
کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی ایسے ملک پر غیر اسلامی حکومت قابض ہو جائے جو چاروں طرف سے اسلامی حکومت

واقتدار سے محصور ہو تو یہ قبضہ دیرپا اور ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ کہ اب اسلامی حکومت کا قیام مشکل ہے۔ فقہاء نے اس کی تصریح بھی کی ہے اور آگے ایک مسئلہ کے ذیل میں اس کا کچھ حصہ آئے گا۔

اب رہ گئی تیسری شرط، تو ظاہر ہے کہ مختلف قوانین و تعزیرات کے ذیل میں اور قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی یہاں آئے دن پھانسی دی جاتی ہے۔ اور اس کی بالکل نہیں پروا کی جاتی کہ آیا اسلامی قانون کے رو سے بھی یہ شخص جانی امان کے دائرے سے نکل چکا ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہاں کی عدالتیں عام طور پر موجودہ قوانین کی رو سے مسلمانوں کا مال دوسروں کو دلا رہی ہیں اور اس امر کا کبھی لحاظ نہیں کیا جاتا کہ اس شخص کا مال اسلامی قانون کے رو سے بھی دوسرے کو دلانا جائز ہے یا نہیں۔ روزمرہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کے سود کی ڈگریاں عدالتوں سے جاری ہو رہی ہیں۔ اور ایک سود کیا ایسی بے شمار صورتیں ہیں جن میں اسلامی شریعت کے لحاظ سے ایک شخص کا مال مامون اور محفوظ سمجھا جاتا ہے لیکن ملکی قانون اس کا حقدار دوسروں کو سمجھتا ہے۔

یہ تو جانی اور مالی امان کا حال ہوا۔ اب عزت کی امان کا حال دیکھو! مسلمانوں کو قید کی، عبور دریائے شور کی، جرمانہ کی، تازیانے کی، اور مختلف قسم کی سزائیں مختلف قانونی دفعات کے ذیل میں دی جاتی ہیں، لیکن کیا اس وقت اس کا بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس سزا پانے والے کی عزت اسلامی قانون کی رو سے بھی اس سلوک کی مستحق ہو چکی تھی؟ میں نہیں کہنا چاہتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو امن نصیب نہیں ہے۔ بلکہ میری مراد یہ ہے کہ انہیں اسلامی امن حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ نے خود "امنا بالامان الاول" کی تشریح میں جو لفظ ارشاد فرمایا ہے وہ یہ ہے۔

امنا بالامان الاول هو امان المسلمين (بدائع) یعنی وہ امان جو مسلمانوں کے قانون کے لحاظ سے ہو۔

عالمگیری میں اس کی توضیح اور زیادہ کھلے لفظوں میں کر دی گئی ہے:

ای الذی کان ثابتاً قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ رمنقول از شامی ج ۳ ص ۲۷۷

یعنی غیر اسلامی حکومت کے تسلط سے پیشتر مسلمانوں کو اپنے اسلام کی وجہ سے اور ذمیوں کو عقد ذمہ کی وجہ سے جو امان تھی وہ باقی نہ رہے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جس ملک میں غیر اسلامی قوتوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے اور جس ملک میں غیر اسلامی قوانین نافذ ہو چکے ہیں اس کو اسلامی ملک کہنا یا وہاں اسلامی راج ہونے کا دعویٰ کرنا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ دوسروں کے ملک کو دوسروں کی حکومت کو زبردستی اسلامی ملک فرض کرنے کی دنیا کی کون حکومت مسلمانوں کو اجازت دے سکتی ہے بلکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اسے جرم قرار دے۔

اسلامی فقہا کبھی کبھی اس ملک کی تعبیر دارالحرب سے کرتے ہیں۔ غالباً اسی سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ متقدمین علماء اسلام زیادہ تر ایسے ممالک کے متعلق دارالاسلام کے مقابلہ میں دارالکفر کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ ابھی ابھی صاحب بدائع کی عبارت گذر چکی انہوں نے اپنی کتاب میں عموماً دارالکفر کی اصطلاح لکھی ہے جس کے سیدھے اور سادے معنی یہ ہیں کہ "جہاں اسلامی حکومت نہ ہو"۔ آخر جہاں اسلامی حکومت نہ ہو گی، جو ملک مسلمانوں کے قبضہ میں نہ ہوگا۔ اس کو کیا مسلمان مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کا ملک کہدیں؟ لفظوں پر چونکنے کا یہ عجیب لطیفہ ہے۔ یہ تو پہلے سوال کا جواب تھا۔ اب دوسرے سوال کی تفصیل سنئے۔

غیر اسلامی حکومتوں میں مسلمانوں کی آزادی کی زندگی کا دستور العمل

گذر چکا ہے کہ اسلام مسلمانوں کو آزادی فرض کرتا ہے اور آزادی کو ان کا فطری اور آسمانی حق قرار دیتا ہے لیکن فقہاء اسلام نے یہ فرض کر کے کہ اگر عارضی طور پر کسی مسلمان کو غیر اسلامی حکومتوں میں کسی وجہ سے جانے اور رہنے کی

ضرورت پیش آئے تو اس وقت اس حکومت سے اور اس حکومت کے باشندوں سے اس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی، اسلامی قانون کی صراحت کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس مسلمان نے اس ملک کی حکومت سے اس امر کا معاہدہ کیا ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین نافذہ کی پابندی کرے گا، یعنی امن و امان میں خلل انداز نہ ہوگا۔ شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں ایسے مسلمان کو "مسلم مستامن" کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں معاہدے کے متعلق عام قانون یہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ۔	کامیاب مسلمان وہ ہیں جو اپنے وعدوں کی نگرانی کرتے ہیں۔
اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ	معاہدوں کی پابندی کرو

اسلام نے "معاہدہ" کو مسئولیت اور ذمہ داری کے ساتھ شدت وابستہ کر دیا ہے اور یہ تو عام معاہدوں کے متعلق تعلیم ہے خصوصیت کے ساتھ بین الاقوامی معاہدوں کے متعلق ایک واضح قانون ان لفظوں میں مسلمانوں پر عائد کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ (سورۂ توبہ)	جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے اس معاہدہ کے کسی حصہ کو نہیں توڑا اور تمہارے مقابلہ میں کسی دوسرے کی انہوں نے مدد نہیں کی تو ان کے عہد کو پورا کرو،

اس وقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں کہ "عدم عہد" یا غیر اقوام کے "نقض عہد" پر کیا احکام مترتب ہوتے ہیں۔ یہاں "قانون معاہدہ" کی، صرف اس قانونی دفعہ کو پیش کرنا ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ان کے معاہدوں کی تکمیل لازم اور ضروری ہو جاتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی تفصیل فرما دی ہے کہ جو مسلمان معاہدہ کو توڑے گا مذہبی حیثیت سے

اس کا کیا انجام ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے :۔

ان الغادر ینصب لہ لواء یوم القیمۃ فیقال انہ غدرۃ فلان، (ابو داؤد)

معاہدہ توڑنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا گاڑا جائے گا کہ یہ پیمان شکنی کا نشان فلاں شخص کا ہے۔

وفی روایۃ لکل غادر لواء یرکز عند باب استہ یوم القیامۃ یعرف بہ غدرہ۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ پیمان شکن کے مقام مخصوص پر نشان گاڑا جائے گا اور اسی سے وہ قیامت کے روز پہچانا جائے گا۔

جب لشکر کو رخصت فرماتے تو امرا جیوش کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ وصیت فرماتے :۔

لاتغلوا ولا تغدروا۔

دیکھنا کسی کے ساتھ خیانت نہ کرنا اور معاہدہ کو نہ توڑنا

یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے "نقض عہد" کی اجماعی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، ابن ہمام فرماتے ہیں :۔

الغدر حرام بالاجماع " فتح القدیر ص ۳۳۶

عہد شکنی (غدر) کے متعلق اجماع ہے کہ وہ حرام ہے۔

مسلمانوں کی بے نظیر امن پسندی

ظاہر ہے کہ "قانون معاہدہ" کی ان تحقیقوں کے بعد جو مسلمان کسی غیر اسلامی حکومت سے امن کا معاہدہ کرنے کے بعد اس کی قلمرو میں بحیثیت "متامن" رہتا ہے اس کی ذمہ داریاں کتنی سخت ہو جاتی ہیں۔ ہدایہ میں ہے :۔

اذا دخل المسلم دار الحرب فلا یحل لہ ان یتعرض لشیء من اموالھم لامن دمائھم لانہ ضمن ان لا یتعرض لھم بالاستئمان۔

یعنی مسلمان جب کسی غیر اسلامی ملک (دار الحرب) میں داخل ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہاں کے باشندوں کے مال یا جان سے وہ کوئی تعرض کرے کیونکہ وہ اس کا ضامن ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا اور یہ ذمہ داری معاہدۂ امن کا نتیجہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب کسی حکومت سے کوئی مسلمان معاہدہ کرنے کے بعد اس کی سرزمین میں داخل ہو تو اس حکومت نے دوسروں کے جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے جو قوانین نافذ کیے ہوں ان کی خلاف ورزی کرنا اس کے لیے قطعاً ناجائز ہے جس قسم کے افعال کو اس غیر اسلامی حکومت نے خلاف قانون قرار دیا ہو ان کے ارتکاب کی وجہ سے وہ نہ صرف قانوناً ہی مجرم ہوگا بلکہ "قانون معاہدہ" کی رو سے وہ غدر کا مرتکب بھی ہوگا۔ اسلام کا قرآن کا خدا کا مجرم ہوگا، گنہگار ہوگا۔ ایک ایسے فعل کا مرتکب ہوگا جس کی حرمت قرآن و حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ کیا کوئی ہے جو اپنے مذہب میں بھی غیر اقوام کے آئین و قانون کی پابندی کو اس قدر ضروری ثابت کر سکے۔ مسلمانوں پر بدامنی کا الزام ہے لیکن لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان سے زیادہ امن پسند اور پابندِ آئین و قانون قوم دنیا میں کوئی نہیں۔

"فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"

بعض علماء اسلام نے غالباً اسی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص ڈاک کے خطوط میں مقررہ وزن سے زیادہ وزن بغیر محصول ادا کرنے کے اضافہ کرتا ہے، اور جو ریل پر مقررہ وزن سے زیادہ وزن کا اسباب لیجاتا ہے، صرف قانون وقت ہی کا نہیں بلکہ عند اللہ بھی مجرم ہے، اپنے مذہب کا مجرم ہے۔

بین الاقوامی قانون کا ایک اہم سوال

یہاں بین الاقوامی قانون کا ایک اہم سوال ہے جس کی توضیح کی سخت ضرورت ہے۔ عموماً اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ دوسرے قوانین میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا ہو لیکن بین الاقوامی قوانین کے دائرہ میں اسلامی قانون نے اس سوال کو اٹھایا ہے مختلف اقوام مختلف اوقات میں موقع پاکر ایک دوسرے پر چڑھائیاں کرتی ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کے جان و مال، مملوکات و مقبوضات پر حملہ بولدیتی ہے

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ حملہ جائز ہے یا ناجائز، اور جائز ہے تو کن صورتوں میں؟ بلکہ اس وقت ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے کہ ایک قوم نے جو دوسری قوم کے مملوکات پر اس طرح قبضہ کرلیا، آیا یہ قبضہ مفید ملک صحیح ہے؟ یعنی قبضہ کرنے والا کیا قانونی اور مذہبی حیثیت سے اس کا مالک ہوگیا؟ ایک پکے دین دار آئینی مسلمان کو اس سوال کے حل کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آجاتی ہے جس وقت مثلاً فرض کیجیے کہ کسی انگریز کو جنگ میں جرمنی یا اور کسی قوم کا مال ملا اور انگریز اس کو کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ دوسری قوموں کو اس سے بحث ہو یا نہ ہو لیکن مسلمان اپنی کسی ملک کو اس وقت تک صحیح ملک نہیں سمجھتا جب تک کہ اسلامی قانون اس کی صحت کا فتویٰ نہ دے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی شریعت سے پوچھے کہ آیا انگریز جرمنی کے اس مال کا مالک ہوا یا نہیں؟ اگر ہوگیا ہے تو اس کا بیچنا اور ہمارا خریدنا اور خرید کر اپنے تصرف میں لانا صحیح ہوگا۔ لیکن اگر انگریز خود ہی ناجائز مالک ہوا ہے تو اس کو بیچنے کا حق نہیں۔ اور جب اسی کو بیچنے کا حق نہیں تو میں خریدنے کے بعد اس کا کس طرح مالک ہوجاؤں گا؟ بہرحال یہ بین الاقوامی قانون کا ایک نہایت دلچسپ سوال ہے۔ فقہائے اسلامی نے اس کے متعلق مستقل ابواب قائم کیے ہیں اور اس کے جزئیات کی انہوں نے کافی تفصیل کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم[1] قوم کے مملوکات پر اس طرح قبضہ کیا گیا ہے تو اسلام اس قبضہ کے بعد قبضہ کرنے والے کو مال کا مالکِ صحیح قرار دیتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے:

اذا غلب الترک ای کفار الروم اگر ترک کے کفار یورپ کے کافروں پر قبضہ پالیں

[1] آئندہ اس کا خیال رہے کہ میں غیر مسلم سے ہمیشہ ان لوگوں کو مراد لیتا ہوں جو مسلمان نہ ہوں اور نہ کسی اسلامی حکومت نے ان کی جان و مال کی ذمہ داری اپنے سر لی ہو۔

فسبوهم واخذوا اموالهم ملكوها (ج ۳ ص ۱۵۲) اور اُن کو لوٹ لے جائیں۔ ان کے مال لے لیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کے مملوکات پر کامل قبضہ حاصل ہو گیا اس صورت میں بھی امام مالک امام احمد اور ہمارے ائمہ ابو حنیفہ وغیرہ رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے۔

اذا غلبوا على اموالنا والعياذ بالله واحرزوها بلادهم ملكوها (ہدایہ) اور اگر کفار ہمارے یعنی مسلمانوں کے مال پر بھی خدا نخواستہ قابو پالیں اور اس کو اپنے ملک میں لیجائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

پس یہی نہیں کہ غیر مسلم اسی صورت میں صرف غیر مسلم ہی کے مملوکات کا جائز اور صحیح مالک ہو جاتا ہے، بلکہ اگر کافر کو مسلمان کے مالوں پر بھی اس طرح کامل قبضہ حاصل ہو جائے تو اسلام اس ملک کی بھی تصحیح کر سکتا ہے اور کافر کو اس مال کا مالک جائز قرار دیتا ہے۔ کیا یہی اسلام کی رواداری ہے؟

اموال معصومہ وغیر معصومہ اور ان کی اباحت و عدم اباحت

چونکہ فانی الذکر مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو دوسرے ائمہ سے اختلاف ہے اس لیے فقہا نے قرآن و حدیث اور مختلف اسلامی مستندات سے اس قانون کے خالص اسلامی قانون ہونے کے نہایت واضح ثبوت پیش کیے ہیں۔ لیکن مضمون طویل ہوتا جاتا ہے اس لیے اس کے نقل کی ضرورت نہیں۔ میں اس موقع پر صرف اس قانونی تنقیح کو پیش کرتا ہوں جس کو قرآن و حدیث سے حاصل کیا گیا ہے:

ان الاستيلاء ورد على مال مباح فيعقد سببا للملك (ہدایہ ص ۲۵۵) جائز اور مباح مال پر کفار کا قبضہ ہوا ہے اس لیے یہ قبضہ ملک کا سبب بن جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا مال مسلمان کے لیے تو بلاشبہ معصوم اور محفوظ ہے ہر مسلمان ذمہ دار ہے کہ دوسرے

مسلمان کے مال کو بلا وجہ نہ لے لیکن غیر قوموں پر یہ قانون عائد نہیں ہوتا اسلیے تو یہ مباح ہوگا۔ چنانچہ شامی میں ہے

لان العصمة من جملة الاحکام المشروعة وهم لم یخاطبوا بها فبقی فی حقهم ملکا غیر معصوم ای هو مباح یملکونه (ص۲۶۷ ج ۳)	کیونکہ عصمت تو ایک اسلامی قانون ہے غیر اسلامی ملک کے باشندے اس قانون کے محکوم نہیں ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا مال ان کے حق میں معصوم نہیں ہے، یعنی وہ ان کے لیے جائز اور مباح ہے پس وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

اب قدرتی طور پر تیسری صورت سامنے آجاتی ہے کہ اسی طرح اگر کسی مسلمان نے غیر مسلم مقبوضات وملوکات پر قبضہ کرلیا تو وہ اس کا مالک ہوگا یا نہیں؟ اسی بین الاقوامی قانون کے اصول سے اس کا جواب بالکل ظاہر ہے جب غیر مسلم مسلمان کے مال کا مالک ہوجاتا ہے تو آخر مسلم کو بھی یہ حق مذہباً ودیناً واخلاقاً وقانوناً کیوں نہ دیا جائے گا۔ بدائع میں ہے۔

مَالُ الْحَرْبِیِّ مُبَاحٌ لانہ لاعصمة لمال الحربی۔ (ص۱۳۲ کاسانی)	یعنی غیر مسلم جس کی جان ومال کی ذمہ دار کوئی اسلامی حکومت نہیں ہے اس کا مال مباح ہے کیونکہ ایسے غیر مسلم کا مال معصوم نہیں ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جن قوموں نے اپنی جان ومال کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد نہیں کی ہے، اسلام کی حفاظت اور ذمہ داری سے جنہیں انکار ہے، اگر اسلام بھی ان کی ذمہ داریوں سے انکار نہ کرے تو آخر وہ کیا کرے؟ تم اگر خدا سے برأت کا اعلان کرتے ہو تو خدا بھی تمہاری جان و مال کی ذمہ داری سے برارت کا اظہار کیوں نہ کرے؟ اسی لیے قرآن پاک میں ہے:-

اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔	شرک کرنے والوں سے خدا بری ہے۔

اس کے سوا کوئی اور صورت کیا ہوسکتی تھی؟ جب دنیا کی تمام قومیں موقع اور قوت پاکر مسلمانوں کی جان ومال اور ملوکات پر قبضہ کرلیتی ہیں جیسا کہ قرآن کا خود بیان ہے کہ:-

وَاِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَاۤءً وَّ	اگر تم پر ان کو قابو مل جائے تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں
يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ	اپنے ہاتھ چھوڑیں، زبان سے برائی پہنچائیں، وہ تو
بِالسُّوْۤءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (ممتحنہ)	یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی خدا کے ناشکر بن جاؤ۔

توکیا اس قرآنی اور واقعی حقیقت کے بعد یظلم نہ ہوتا، اگر مسلمانوں کا مذہب ان کو بھی اس کی اجازت نہ دیتا؟ قرآن نے اگر اس کے بعد یہ حکم دیا ہے کہ۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ	مقابلہ کرو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے
الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	اور نہ آخرت کے دن کو مانتے ہیں اور نہ ان چیزوں
وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا	کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے
الْكِتٰبَ (الآیۃ)	حرام کیا اور نہ سچے آئین اور دین کو اپنی زندگی کا

دستور العمل بناتے ہیں ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی۔

توکیا اس کا مفاد اس کلیہ سے زائد ہے جو ابھی اسلامی فقہا کی تنقیح میں گذر چکا، یعنی مسلمانوں کا مال، مسلمانوں کے مملوکات جس طرح غیر مسلم اقوام کے لیے خود اسلامی قانون کی رو سے مباح ہیں اسی طرح وہ اور ان کے اموال بھی اللہ، اور اس کے رسول کی شریعت اور قانون کی رو سے مباح اور حلال ہیں۔ اگر مسلمان ان پر قبضہ کرلیں گے تو اس کے صحیح مالک اور ہر قسم کے تصرفات کے مجاز و مختار ہوں گے[1]۔

[1] یہ خیال کرنا کہ برارت اور مقاتلہ کا حکم صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے جو قتالی اور مصافی ہیں، لیکن جو غیر مسلم قوم مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتی اور نہ ان کی ذمی ہے اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے، قرآن اور حدیث سے جہل کا نتیجہ ہے۔ آخر یعد کم احدی الطائفتین میں خدا نے غیر مصافی قافلۂ تجار کا بھی وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ صحابہ کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اگر ایسا کرنا حرام تھا تو قرآن کو ٹوکنا چاہیے تھا۔ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں بھی ابوبصیر صحابی اور ان کے رفقاء کا گذر صرف تجارتی قافلہ کے اموال غیر معصومہ پر ہوا تھا۔ حضرت ابوذر بھی ایک (بقیہ حاشیہ صہ ۲۹)

عود الی المقصود

بہرحال اصلی بحث یہ تھی کہ غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل کیا ہونا چاہیے۔ اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی بیچ میں ایک مسئلہ کا ذکر آگیا، بات تو بہت عام تھی لیکن صحیح خیالات کے لیے مجھے اصل بحث سے تھوڑی دیر کے لیے دور ہو جانا پڑا اب میں پھر اپنے اصلی مدعا کی طرف آتا ہوں۔

تکملہ حاشیہ صہ ۲۸ زمانہ میں یہی کھاتے تھے۔ بہرحال قتالی ہو یا غیر قتالی، امیر کا اذن ہو یا نہو، غیر ذمی کفار مباح الدم والاموال ہیں ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

ولا نعلم احداً من الفقہاء یحظر (منع) قتال من اعتزل قتالنا من المشرکین۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ایما قریۃ اتیتموھا فاقمتم فیھا فسھمکم فیھا وایما قریۃ عصت اللہ ورسولہ فان خمسھا للہ ورسولہ ثم ھی لکم۔ اس کی شرح میں قاضی عیاض لکھتے ہیں: ان المراد بالقریۃ الاولیٰ ھی التی لم یوجف علیھا المسلمون بخیل ولا رکاب بل اجلیٰ عنھا اھلھا وصالحوا فیکون سھمھم فیھا کما تقرر فی الفیٔ ۱۲ ابل السلام۔

ترجمان القرآن۔ یہاں مولانا سے بڑی چوک ہوئی کہ انہوں نے محارب Belligerent اور غیر محارب Non-belligerent کے فرق کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ محارب وہ قوم ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو۔ ایسی قوم کا کوئی فرد اگر وہ بالفعل مقاتل (Combatant) ہو یا نہ ہو، بہرحال اس کا مال مباح ہے۔ ہم اس کے تجارتی قافلوں کو گرفتار کر سکتے ہیں اس کے افراد ہماری زد میں آئیں گے تو ہم ان کو پکڑیں گے اور انکے اموال پر قبضہ کر لیں گے مولانا نے جتنی مثالیں پیش کی ہیں وہ سب اسی قبیل کی ہیں لیکن جو قوم ہم سے برسرِ جنگ نہیں، وہ خواہ معاہدہ ہو یا نہ ہو اس کے اموال ہمارے لیے مباح نہیں۔ قرآن میں تصریح ہے کہ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ (الممتحنہ) یہ بات عین مقتضائے عقل و انصاف ہے۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے لیے مطلقاً ہر غیر ذمی کافر کا مال مباح ہو، جیسا کہ مولانا کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے، تو مسلمانوں کی قوم اقوام عالم کے درمیان امۃً وسطاً ہونے کے بجائے ایک لٹیری قوم بن جائے گی، غیر قوموں پر ڈاکے مارنا اس کا پیشہ قرار پائیگا، بقیہ سلسلہ حاشیہ بر صہ ۳۰

میں عرض کر چکا ہوں کہ "مستامن مسلمان" کے لیے فرض ہے کہ جس غیر اسلامی حکومت میں وہ امن کی ضمانت لے کر داخل ہوا ہے وہاں کے مروجہ قوانین کی سختی سے پابندی کرے کسی کے مال و جان، عزت و آبرو پر حملہ کر کے قانون وقت کو توڑنا غدر ہے۔ اور غدر قرآناً و حدیثاً و اجماعاً حرام ہے۔ الغرض قانون وقت کی پابندی اس کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قانون ملکی کے خلاف لفافہ میں نصف ماشہ کا بھی اضافہ یا ریل کے سامان میں پاؤ سیر کی زیادتی بھی اس کے لیے ناجائز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ امن پسند قوم مذہبی حیثیت سے کوئی نہیں ہو سکتی

لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ "اسلامی قانون" کی رو سے ایک فعل ناجائز ہے مثلاً یہی سود کا مسئلہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی دوسرے کا مال لینا اسلام میں قطعاً حرام ہے اگر غیر اسلامی قانون میں اس ذریعہ سے تحصیل مال کی اجازت ہے۔ نہ صرف رعایا کو اجازت ہے بلکہ حکومت بھی بڑے وسیع پیمانے پر مختلف صورتوں میں اس کا کاروبار کرتی ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان کو

تکملہ حاشیہ ۲۹ اور دنیا میں اس کا وجود ایک بلائے عام Public nnisanee بن جائیگا رہا یہ سوال کہ جب غیر مسلم مسلمانوں کے مال پر ظالمانہ قبضہ کر کے اس کا مالک ہو سکتا ہے تو مسلم بھی کیوں نہ اس کے مال پر قبضہ کرنے کا مجاز ہو، تو یہ بھی درحقیقت حالت جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ حالت امن میں اسلام اپنی رعایا کو دوسری غیر محارب قوموں پر ڈاکہ زنی کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہاں اگر دوسری قوم کے افراد مسلمانوں پر ڈاکہ زنی کی ابتدا کریں تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی اور اس وقت مسلمانوں کے لیے ان کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔ قرآن میں جہاں مشرکین سے اعلان برأت کیا گیا ہے وہاں صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (یعنی ظلم کی ابتدا ان کی طرف سے ہوئی تھی) پس مسلمان اپنی طرف سے سلب و نہب کی ابتدا نہ کریں گے۔ بلکہ جب ابتدا دوسروں کی طرف سے ہو گی، تو وہ معاہدہ کی صورت میں فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ پر اور پہلے سے معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں اعلان جنگ پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد تمام قوم حربی قرار پائے گی اور اس کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔

کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اگر وہ "متامن مسلمان" اس ذریعہ سے اُس ملک کے غیر مسلم باشندے کا مال حاصل کرتا ہے تو نقض معاہدہ یا قانون شکنی یا غدر کا وہ قطعاً مرتکب نہیں ہے، اور اس لحاظ سے مذہبی طور پر وہ قانون معاہدہ کا تو قطعاً مجرم نہیں۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ کیا اس نے کسی دوسرے سے ایسے مال کو حاصل کیا ہے جس کے لینے کا گو قانون ملکی نے اسے مجاز گردانا ہے، لیکن مذہب یا خدا اُس کے لینے سے روکتا ہے؟ یا یوں کہو کہ کیا اس نے ایسا مال حاصل کیا ہے جو قانوناً نہ سہی لیکن اسلام کی رو سے وہ مباح نہ تھا بلکہ معصوم تھا؟ ابھی شریعت "اسلامی قانون" بلکہ قرآن سے گذر چکا ہے کہ اس قسم کا مال مسلمان کے لیے مذہباً غیر معصوم ہے اور مباح ہے[1]۔ پھر ایک مسلمان کیا کرے؟ قرآن اور مذہب جس کو غیر معصوم اور مباح کہتا ہے کیا وہ اپنے مذہب سے روگردانی کرکے اس کو معصوم اور غیر مباح کہدے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس مال کو نہ قانون ناجائز قرار دیتا ہے اور نہ شریعۃ حرام قرار دیتی ہے بلکہ اس کے لینے کا حکم دیتی ہے، غریب مسلمان آخر اس جائز کو کس طرح ناجائز اور اس حلال کو کس طرح حرام کردے؟ کیا وہ سلطنت کے قانون سے بغاوت کرے یا شریعت کے حکم کو توڑے؟ کیا اس کے بعد مسلمان کے لیے کہیں بھی پناہ ہے؟

اسلامی قوانین کا یہی وہ اضطراری مقتضا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے سب سے بڑے محتاط بلکہ بقول بعض عوام، سخت گیر امام الائمہ، قدوۃ الاتقیاء قائم اللیل، التابعی المجتہد المطلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ نہایت بین اور غیر مبہم واضح لفظوں میں امام محمدؒ نے "سیر کبیر"

---

[1] ترجمان القرآن۔ یہ اباحت صرف اس صورت میں ہے جبکہ ایک قوم محارب ہو۔ اگر غیر محارب قوم کے مال کو بھی اسی طرح مباح سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان میں کسی غیر مسلم کے مال کو لوٹنے یا چرا لینے یا رشوت و خیانت کے ذریعہ لینے والا مسلمان صرف قانون ملکی کا مجرم ہوگا، اور مذہباً اسے محض اس بنا پر گنہگار سمجھا جائے گا کہ اس نے قانون معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے نہ کہ اُن احکام اسلامی کی جن میں ان افعال کو بجائے خود حرام کیا گیا ہے۔ مولانا کے طرز استدلال کا منطقی نتیجہ یہی ہے مگر ہمیں امید نہیں کہ وہ اس نتیجہ کے قائل ہوں گے۔

میں نقل فرمایا ہے:-

واذا دخل المسلم دار الحرب[1] بامان فلا باس بان یاخذ منھم اموالھم بطیب انفسھم بای وجہ کان لانہ انما اخذ المباح علی وجہ عری عن الغدر فیکون ذالک طیبا لہ۔

(منقول از شامی ص ۲ ج ۴ مطبوعہ مصر)

جب مسلمان دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں امن کا معاہدہ کرکے داخل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں کے باشندوں (غیر مسلم) کی مرضی سے ان کا مال لے خواہ ذریعہ کوئی بھی ہو کیونکہ اس نے ایک مباح مال کو لیا ہے اور ایسے ذریعہ سے لیا ہے جو قانون شکنی (غدر) سے پاک ہے تو یہ مال اس کے لیے پاک اور طیب ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ دار الحرب سے مراد یہاں ایسا ملک ہے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہو جس سے سلطنت اسلامی کا کوئی معاہدہ نہ ہو، اور جہاں سلطنت اسلامی کی مسلم رعایا کے افراد حالت جنگ میں بطور خود امان (Safe eonducts or trade licenses) لے کر غیر معاندانہ کاروبار (Non-hostile intercourse) کے لیے رہ جائیں حنفی قانون کی اس دفعہ کو ایسے دار الکفر پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا جو پورا دار الکفر بھی نہ ہو اور جہاں مسلمان ایک قوم محارب بن کی حیثیت سے نہیں بلکہ علاقائی حیثیت سے آباد ہو اور اسے اپنی حد تک اپنے پرسنل لا کی پابندی کا حق بھی حاصل ہو۔ مولانا کے نظریہ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ہر غیر ذمی کافر کو حربی (Enemy) اور ہر غیر مسلم مقبوضہ کو دار الحرب سمجھ رہے ہیں۔ یہ اسلام کے بین الاقوامی قانون کی بالکل غلط تعبیر ہے غیر مسلم کا مال اور خون صرف حالت جنگ میں مباح ہے، اور وہ بھی اسلامی سلطنت کی رعایا کے لیے نہ کہ خود اس غیر مسلم سلطنت کی مسلم رعایا کے لیے جس کو آپ حربی قرار دے رہے ہیں حنفی قانون کا منشا صرف اس قدر ہے کہ جب کوئی مسلمان دشمن کے ملک میں امان لے کر جائے تو وہاں وہ عقود فاسدہ پر بیع و شرا کر سکتا ہے۔ یہ اجازت دو وجوہ پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ دشمن کا مال فی الاصل مباح ہے۔ جب اس کو بجبر چھین لیا جا سکتا ہے تو عقد فاسد کے ذریعہ سے حاصل کرنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ جنگ کی حالت ایک اضطراری حالت ہے اور اضطرار میں حرام حلال ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ اس عہد تاریک کا نہیں ہے جس وقت مسلمان محکوم تھے۔ جس زمانہ میں امام رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت سے اس قانونی دفعہ کو پیدا کیا تھا، غالباً اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی مسلمانوں کے اعمال و افعال عقائد و رسوم کی وہ "زشتی" نہ تھی جو "نادر یورپ" کی صورت میں یکایک ظاہر ہو گئی[1] یہاں تک کہ عباد صالحین نے قوم عابدین کو عبادت کے کٹھرے کی طرف بھگانے کے لیے اپنی میراثوں میں، غوثی و قطبی میراثوں میں ان شیروں کو کچھاروں سے چھوڑ دیا جو سب پر رحم کر سکتے ہیں، لیکن جن کا فریضہ عبادت تھا ان کے پاس ان کے لیے کوئی رحم نہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ فقہا جب اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کسی اسلامی مقبوضہ پر فرض کرو کہ غیر اسلامی حکومت قابض ہو جائے تو معاً بطور "جملہ معترضہ" کے "عیاذاً باللہ" کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں، یعنی اس فرض کو بھی وہ فرض کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام اعظم نے

[1] ترجمان القرآن۔ غالباً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ خیال میں یہ بات بھی نہ تھی کہ جو حکم انہوں نے دشمن کے ملک میں امان لے کر جانے والے مسلمان تاجروں یا سیاحوں کے لیے بیان کیا تھا اس کو غیر اسلامی مقبوضات میں مستقلاً رہنے والے اُن کروروں مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے گا جو غیر مسلم حکومت کے ماتحت اتنی آزادی ضرور رکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشی و عمرانی قوانین کی پابندی کر سکیں۔ امام صاحب نے جو قانون بیان فرمایا ہے وہ صرف ایسے دارالحرب (Belligerent Country) کے متعلق ہے جس میں کوئی مسلمان کاروبار کے لیے امان لے کر جائے۔ ان کا یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ مسلمان جہاں غیر مسلم حکومت کے تحت ایک کثیر تعداد میں مستقل بود و باش رکھتے ہوں وہاں وہ اسلام کے معاشی قانون سے آزاد ہیں اور جن مالی معاملات کو اسلام نے حرام کیا ہے وہ سب وہاں کیے جا سکتے ہیں ایسی جگہ تو مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نہ صرف سرمایہ داری نظام سے بچیں بلکہ اپنی پوری اجتماعی قوت اس نظام کو توڑنے اور اسلام کے معاشی نظام کو قائم کرنے میں استعمال کریں لیکن مولانا جس طریق پر اسلامی قانون کی تعبیر فرما رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنی قومی طاقت کو سرمایہ داری نظام کے استیصال پر صرف کرنے کے بجائے خود اسی نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔

کسی وقت ضرورت کے آگے نہیں بلکہ کتنی شریعت کی مجبوریوں کے آگے گردن جھکا دی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس فتوے کی عملی تصدیق صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ جس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم و ایران کی باہمی آویزشوں کے زمانہ میں قرآن مجید کی پیش گوئی پر اصرار کرتے ہوئے ایک غیر اسلامی ملک یعنی مکہ مکرمہ میں (جو اس وقت حکومت اسلامیہ کے تحت تھا) قریش سے یہ شرط لگائی کہ قرآن ہی کی پیش گوئی پوری ہو گی تو جب وہ پوری ہوئی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے اونٹ لینے کا حکم دیا اور یہ اونٹ وارثوں سے وصول کیے گئے (ترمذی) فقہاء اسلام اس عمل سے اس اسلامی قانون کی توثیق کرتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شرط "صریح قمار (جوا) ہے جس کی حرمت قطعی نصوص سے ثابت ہے[1]۔

دار الحرب میں سود حلال نہیں بلکہ فی حلال ہے

لوگوں میں یہ عجیب بات مشہور ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں سود حلال ہو جاتا ہے، اور زیادہ تر اصل مسئلہ کے نہ سمجھنے میں یہی تعبیر مانع آتی ہے ورنہ مسئلہ کی بنیاد جس قرآنی قانون پر ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ جو چیز حرام تھی وہ کسی وقت حلال ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو چیز ہمیشہ سے حلال تھی وہی حلال ہوئی۔ خدا جس چیز کو حلالاً طیباً فرماتا ہے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی کو طیب فرماتے ہیں، ورنہ ایک مسلمان کو اس کا کیا حق ہے کہ قرآن جس چیز کو حرام کرے اسے وہ اپنی رائے سے یا کسی معمولی ظنی خبر کی بنیاد پر حلال کر دے

[1] ترجمان القرآن۔ ترمذی میں تصریح ہے کہ یہ شرط اس زمانہ میں ہوئی تھی جب تحریم ربا ان کا حکم نہیں ہوا تھا تفسیر ابن جریر میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے۔ پھر تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اس شرط کا مال ابی بن خلف کے ورثاء سے وصول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا حضور نے فرمایا کہ اسے صدقہ کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مال مکروہ تھا۔ دشمن سے لے لیا گیا مگر اسے خود اپنے استعمال میں لانا پسند نہ کیا گیا۔

خصوصاً وہ جو واحد خبروں سے نص پر اضافہ کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ علاوہ ای وجہ کان (قانون وقت کے جس جائز کردہ ذریعہ سے بھی وہ مال ملتا ہو) کی عمومیت کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سود ہی کو نہیں بلکہ قمار (جوا) کے ان ذرائع سے بھی تحصیل مال کو طیب قرار دیا ہے جس کی قانون وقت میں ممانعت نہ ہو مثلاً یہی بیمہ ہے یا لائف انشورنس کا ذریعہ ہے[1]۔ علمار اسلام کے نزدیک

[1] ترجمان القرآن۔ دار الحرب کے جو احکام فقہ حنفی میں حالت جنگ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ہندوستان پر چسپاں کرکے مولانا سخت غلطی کر رہے ہیں اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہندوستان میں جوے اور لاٹری اور بیمہ کے ذریعہ سے بھی مسلمان روپیہ کما سکتے ہیں اور یہ مال ان کے لیے طیب ہے۔ اگر اسی پر فتویٰ ہو جائے تو معاشی حیثیت سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں قطعاً کوئی فرق نہ رہے گا اور جہاں تک معاشی زندگی کا تعلق ہے، تمام مسلمانان ہند غیر مسلم ہو جائیں گے۔ اصلی غلطی یہ ہے کہ مولانا ہر اس غیر مسلم کے مال کو مباح سمجھ رہے ہیں جس کی ذمہ داری کسی اسلامی حکومت نے نہ لی ہو۔ حالانکہ اس نظریہ کی تائید قرآن و حدیث کے کسی حکم سے نہیں ہوتی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ایسے دار الکفر کو جو من وجہ دار الکفر اور من وجہ دار الامن اور دار الاسلام ہو چکا ہو، دار الحرب قرار دے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف سوء تعبیر ہے بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے نہایت مہلک بھی ہے۔ ہندوستان اس وقت دار الحرب تھا جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی اس وقت مسلمانوں کا فرض تھا یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جانیں لڑاتے۔ یا اس میں ناکام ہونے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے لیکن جب وہ مغلوب ہو گئے، انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول کر لیا تو اب یہ ملک دار الحرب نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہاں تمام اسلامی قوانین منسوخ نہیں کیے گئے ہیں نہ مسلمانوں کو احکام شریعت کے اتباع سے روکا جاتا ہے نہ ان کو اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے ملک کو دار الحرب ٹھیرانا اور ان رخصتوں کو نافذ کرنا جو محض دار الحرب کی مجبوریوں کو پیش نظر رکھکر دی گئی ہیں۔ اصول قانون اسلامی کے قطعاً خلاف ہے، اور نہایت خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں اسلامی قوانین پر عمل درآمد کرنے کے جو اختیارات حاصل ہیں ان سے بھی وہ خود بخود دست بردار ہو جائیں گے شریعت کے جو حدود اس وقت ان کے قومی وجود کی حفاظت کر رہے ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں گے اور مسلمان غیر اسلامی نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے تعجب ہے کہ مولانا نے اپنے مضمون کے ابتدائی حصہ میں تو مسلمانوں کے اندر روح پھونکنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی اجتماعی قوت سے کام لے کر غیر مسلموں میں نظام اسلامی کے اصول پھیلانے کی کوشش کریں اور غیر اسلامی نظام کے طلسم کو توڑنے کے لیے ایک اقدامی طرز عمل (forward policy) اختیار کریں مگر آگے بڑھ کر انہوں نے مسلمانوں کو پسپائی کا درس دینا شروع کر دیا۔ انتہائی اضطرار کی حالت میں مسلمانوں کے ایسے منتشر افراد کو جن کی کوئی اجتماعی طاقت نہ ہو، اور جو معاندین کے درمیان گھرے ہوئے ہوں، اسلام اپنے قانون کی

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۶

قمار اور سود کی یہ مرکب شکل ہے لیکن سیر کبیر میں امام محمدؒ امام اعظمؒ سے ناقل ہیں۔

و اخذ ما لا منهم بطريق القمار فذلك كله طيب۔

اگر ان سے (غیر مسلموں سے) جوے کے ذریعے مال لے گا تو یہ سب اس کے لیے پاک اور طیب ہے،

سود کی شہرت کا سبب غالباً امام مکحول (جو محدثین کے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں)، کی وہ مرسل حدیث ہے جو اسی مسئلہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے :-

عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا ربوٰ بين الحربي والمسلم (اسنده بيهقى)

مکحول سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حربی (غیر مسلم)، اور مسلمان کے درمیان سود نہیں ہے

لوگ نہ معلوم اس کا مطلب کیا سمجھتے ہیں ورنہ ظاہر الفاظ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ مسلم اور غیر ذمی نا مسلمان کے درمیان اگر سود کا معاملہ ہو تو وہ سود سود ہی نہ ہوگا بلکہ "قرآنی قانون اباحت" کے تحت یہ مال مسلمان کے لیے طیب و حلال ہے۔

بہرحال اسلامی شریعت، قرآن و حدیث، عمل صحابہ کی رو سے یہ ایک ایسا واضح اور صاف قانون ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگ مکحول کی حدیث مرسل کے متعلق حجیت و عدم حجیت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیزیں تو تائید میں پیش کی جاتی ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اموال نے طیب و حلال ہونے کا حکم تو قرآن کے نصوص صریحہ کی واضح عبارت کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵

گرفت ڈھیلی کر کے چند رخصتیں عطا کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ اس حالت میں قیام نہ کرو، بلکہ بعجلت ممکنہ دار الاسلام کی طرف واپس آجاؤ۔ مولانا ان رخصتوں کو ایسی قوم کے لیے عام کر رہے ہیں جو آئمہ لدر کی عظیم الشان تعداد میں ہے اور مستقل طور پر اس ملک میں متوطن ہے۔ دار الحرب کے احکام ایسی قوم کے لیے ہرگز نہیں ہیں اسکو تو صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جن احکام اسلامی پر عمل کرنا ممکن ہو ان پر عمل کرے، بلکہ دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرنی چاہیے۔

نتیجہ ہے۔ علامہ ابن ہمام نے بالکل صحیح لکھا ہے:۔

وفی التحقیق یقتضی انہ لو لم یرد مکحول اجازہ النظر المذکور۔ (فتح القدیر ج ۷، ص ۱۷۸)

اور تحقیق کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر مکحول کی روایت نہ بھی وارد ہوتی تو مذکورۂ بالا "نظر" اس کی اجازت دیتی ہے

صاحب بدائع نے اسی بنیاد پر امام ابوحنیفہ رح کے مذہب کی صحیح تعبیر یہ کی ہے:۔

وعلی ھذا اذا دخل مسلم او ذمی دار الحرب بامان فعاقد حربیا عقد الربوا او غیرہ من العقود الفاسدۃ فی الاسلام جاز (ص ۱۳۲ ج ۷)

اور اس بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسلمان یا ذمی دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں امن کا معاہدہ کرکے داخل ہوا اور کسی غیر مسلم سے ربوا (سود) کا معاملہ کیا یا اس قسم کا کوئی معاملہ کیا جو اسلامی قانون کی رو سے فاسد ہو تو وہ معاملہ جائز ہوگا۔

فیَ اور بھاؤ کی اصطلاح | اور اسی لیے میرا ناچیز خیال ہے کہ اس قسم کی تمام "آمدنیاں" جو مسلمانوں کو غیر اسلامی حکومتوں میں قانوناً میسر آسکتی ہیں، ان کو بجائے سود یا قمار یا جوا وغیرہ کہنے کے مناسب ہوگا کہ اس کا خاص نام "فیَ" رکھدیا جائے جس کے معنی گویا یہ ہوں گے کہ وہ مال جو بغیر کسی حرب و قتال، جنگ و جدال کے دوسری اقوام سے امن پسندانہ طور پر قانون وقت کی پوری پابندی کے ساتھ مسلمانوں کو ملا۔[۱] مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ہندی میں ایک لفظ بھاؤ کا ہے جو

---

[۱] شامی میں ہے وما اخذ منھم بلا حرب ولا قھر کالھدیۃ والصلح فھو لا غنیمۃ ولا فیٔ وحکمہ حکم الفیٔ: ص ۲۵

اور جو کچھ ان سے بغیر جنگ اور زبردستی کے لیا جائے مثلاً خراج یا مال صلح، تو وہ نہ غنیمت ہے اور نہ فیٔ بلکہ اس کا حکم فیٔ کا حکم ہے۔

فتح القدیر میں ہے۔ فکان ھذا اکتساب مباح من المباحات کالاحتطاب والاصطیاد۔۔

یہ اکتساب مباحات میں سے ہوگا جیسے لکڑیاں چننا اور مچھلیاں پکڑنا۔ بقیہ حاشیہ بر ص ۴۳

قریب قریب "فے" کا ہم تلفظ بھی ہے، اور غالباً ایک حد تک اسی معنی کو ادا بھی کرتا ہے۔ خواص تو ان آمدنیوں کو اپنی "فے" کی آمدنی کہیں گے، عوام کی زبان پر "ف" نہ چڑھے گی تو وہ اس کو "پھاؤ" کہدیں گے۔ اس تعین اصطلاح کی ایک بڑی ضرورت وہ وجہ بھی ہے جو بعض ثقات اسلام کی جانب سے اس مسئلہ کے متعلق بطور اندیشہ یا خطرے کے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس مسئلہ کا اعلان کر دیا گیا تو ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد مسلمان اس کو بھول جائیں گے کہ سود قمار اور از یں قبیل دوسرے ذرائع ان کی شریعت میں حرام بھی تھے یا نہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ان آمدنیوں کا نام "فے" رکھا جائے کہ اس لفظ سے مسلمانوں کو یہ یاد آتا رہے گا کہ غیر اقوام سے ان کے شرعی تعلقات کیا ہیں اور غیر اسلامی حکومتوں کے معاہدہ امن کی تکمیل ان کی شرعاً کس حد تک لازم ہے۔[۳] آخر جن کاروباری معاملات سے خدا ناراض نہیں ہے، قانون خوش، حکومت خوش، دینے والے خوش، لینے والے خوش، ان کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کس چیز سے ڈرنا چاہیے۔

(باقی)

بقیہ حاشیہ ص ۳

فے کی تعریف سبل السلام میں ہے هو ما حصل للمسلمین من اموال الکفار من غیر حرب ولا جهاد ام — وہ مال جو مسلمانوں کو کفار کے اموال میں سے بغیر جنگ و جہاد کے حاصل ہو۔

اور اراضی بنی نضیر کے متعلق خود قرآن میں ہے:۔

مَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ — جس پر تم نے دوڑ دھوپ نہ کی ہو نہ گھوڑوں سے نہ اونٹوں سے۔

تمام احادیث کی کتابیں معمور ہیں کہ اس فے کی آمدنی سے اہل بیت نبوت کے ذاتی مصارف پورے ہوتے تھے۔

[۱] ترجمان القرآن۔ قرآن کی اصطلاح میں فے صرف اس مال کو کہتے ہیں جو برسر جنگ قوم سے بغیر قتال کے حاصل ہو۔ سورۂ حشر پڑھ جائیے۔ تمام ذکر حالت جنگ کا ہے۔ بنی نضیر پر چڑھائی کی گئی۔ کارزار کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ مرعوب ہو گئے اور انہوں نے جلاوطن ہونا قبول کیا۔ اس موقع پر جو اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آئے ان کو فے کہا گیا۔ یہ اصطلاح اُن اموال پر کیونکر چسپاں ہو سکتی ہے جو حالت امن میں غیر محارب کافروں سے سود اور قمار بازی اور سٹے اور دوسرے غیر اسلامی طریقوں سے حاصل کی جائے۔ پھر اگر یہ فے بھی ہو تو افراداً فرداً فرداً اس کو کیسے کھا سکتے ہیں۔ اموال فے کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ وہ حکومت کے خزانے میں داخل کئے جائیں اور ان کو عام مصالح اسلامی پر صرف کیا جائے۔ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الحشر۔۱)